

علی احمد تالپور ○ یادیں اور باتیں

INTERNATIONAL URDU WEEKLY کراچی

ہفت روزہ

TAKBEER تکبیر

۲۳ اپریل ۱۹۸۷ء

KARACHI-PAKISTAN

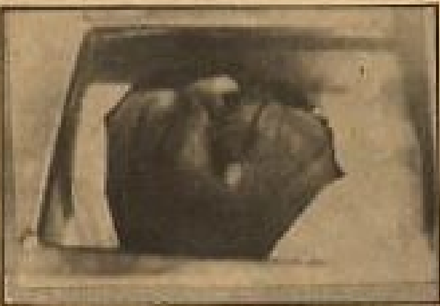
شخصیت

حق مغفرت کرے، عجیب آزاد مرد تھا۔

میر علی احمد تالپور کی باتوں اور یادوں پر مشتمل ایک تاثراتی تحریر۔

حق مغفرت کرے
عجب آزاد مرد تھا

ظہیر احمد کی تاثراتی تحریر



میر علی احمد تالپور کا آخری دیدار



میرے چارہ گر کو نوید ہو صفِ دشمناں کو خبر کرو — جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا

میر علی احمد تالپور 8 ایک باغ و بہار شخصیت

تقسیم ہند کے مخالف ہونے کے باوجود قیام پاکستان کے بعد ان کی زندگی کا ہر لمحہ اس کے دفاع کی جدوجہد میں گزرا

۱۰ اپریل کے اخبارات میں یہ افسردہ خبر اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ نگاہوں کے سامنے تھی کہ میر علی احمد تالپور لندن میں انتقال کر گئے۔

۴ اپریل مسٹر بھٹو کے پھانسی پانے کا دن ہے ان کی آٹھویں برسی کی تقریبات کی خبر ۵ اپریل کو جس وقت لوگ اخبارات میں پڑھ رہے تھے، مسٹر بھٹو کے دلی سے دور ان کے پرانے دوست اور پرانے رفیق میر علی احمد جہانِ جاودانی کے لیے رخت سفر باندھ رہے تھے۔

جس طرح میر برادران کی سیاسی اور سماجی زندگی سے مسٹر بھٹو کو خارج نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح مسٹر بھٹو کی زندگی کا ذکر بھی میر برادران کے ذکر کے بغیر نا تمام رہے گا اور یہ بھی کیسا اتفاق ہے کہ مسٹر بھٹو اور میر علی احمد کا ذکر تاریخ وصال کے اعتبار سے ایک دن کے فرق سے کیا جائے گا۔ ایسا لگتا ہے کہ میر علی احمد اپنی گرجدار آواز میں کہہ رہے ہوں ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ، کل ہماری باری ہے

موت ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جس کا ذائقہ ہر انسان کو چکھنا ہے اور میر صاحب تو ان لوگوں میں سے تھے جن کی محاذ ہی موت ہوا کرتی ہے۔ میر علی احمد تالپور نے وقت کے بڑے بڑے جابر لوگوں کا سامنا کیا، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی۔ وہ بہادری اور جرأت کے اعتبار سے بلوچ روایات کے پکے امین تھے۔ میر صاحب کا تذکرہ میں نے جی ایم سید کی تقریب سالگرہ کی رپورٹ لکھتے ہوئے کیا تھا کیونکہ ۱۷ جنوری کی اس تقریب میں وہ حاضر تھے اور اکتوبر ۱۹۸۶ء سے لندن میں ہونے کے سبب سیاسی جھمیلوں سے دور تھے مگر وہاں بھی میر علی احمد احوالِ وطن سے غافل نہ تھے، اس کا ثبوت ان کے وہ خطوط ہیں جو انہوں نے دوستوں کو لکھے۔

میر علی احمد کے داماد اور بھتیجے میر رفیق احمد تالپور کے دوست نواب سیف الدین بخاری نے جو ایم آر ڈی سے وابستہ ہیں، جب مجھے یہ اطلاع دی کہ میر صاحب لندن کے ہسپتال میں داخل ہیں اور ان پر مسلسل غشی طاری ہے تو دل کو دھچکا لگا اور میں نے بے ساختہ دعا مانگی کہ کاش میر صاحب کی طبیعت سنبھل جائے۔ مجھے حیرت تھی کہ معاشرے، قوم اور ریاست کی بیماریوں کے خلاف نشتر چلانے والا ڈاکٹر، تیغ تو اب ہاتھ میں لے اختلاف لڑنے والا خاکسار سپاہی، کس طرح بیمار ہو گیا۔ میرے دل میں شدت سے یہ خواہش ابھری کہ میر صاحب پوری طرح صحت یاب ہو کر وطن لوٹیں، میں جی بھر کر ان سے باتیں سنوں۔ مخاطب کو سرشار کر دینے والی آواز، جرأت، اشعار، مصلحت اور ریاکاری سے کوسوں دور طرز استدلال اور انتہائی چاہت سے ان کا "بادشاہ سلامت" کہنے کی ادا نگاہوں کے سامنے ہو، وہ بولتے رہیں، میں سنتا رہوں، لیکن آدمی جو چاہتا ہے وہ سب پورا تو نہیں ہوتا۔

مجھے اعتراف ہے کہ میں ایک محروم شخص ہوں، میرے نزدیک، بہت نزدیک میٹھے پانی کا چشمہ ابل رہا تھا لیکن میں پیاسا رہا۔ جب میر صاحب کے یار غار محمد حسن سموں نے نصف صدی سے زیادہ کی رفاقت نبھانے کے باوجود یہ کہا کہ ظہیر میں یتیم ہو گیا، لٹ گیا اور جوان ملک نے بے شمار مجلسوں میں میر صاحب کو سننے کے بعد بھی اس طرح ماتم کیا کہ کاش یہ خبر سچ نہ ہوتی، تو حقیقت یہ ہے کہ میرا شمار تو کسی بھی قطار میں نہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس یگانۂ روزگار شخصیت کی

بھی ناچیز پر بڑی مہربانیاں کیں۔

"ہم نے بہت سی باتوں کو جانتے ہوئے بھی نہ پوچھا اور انہوں نے بہت سی باتوں کو چاہتے ہوئے بھی نہ بتایا!"

یہ جملہ میرے اس انٹرویو کا ہے جو مارچ ۸۵ء کو میر علی احمد سے لیا گیا اور جسے "تکبیر" نے ۱۱ اپریل ۸۵ء کو شائع کیا تھا۔

میرے سامنے میر علی احمد تالپور کی زندگی کے مختلف ادوار ہیں۔ کچھ ادوار کو میں کتابوں اور روایتوں سے دیکھ رہا ہوں اور کچھ میرے ذاتی مشاہدے کے تعلق سے نگاہوں میں آ رہے ہیں۔ ایوبی آمریت کے خلاف جدوجہد، مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کے لئے بے پناہ محبت، پھر بھٹو صاحب کے "مظلوم" بننے پر ان کی محبت بڑھنا، پارٹی بنانے میں ساتھ دینا، ایوب کو چیلنج کرنا، جیل کاٹنا، ایوب خان کے بعد یحییٰ خان سے نمٹنا اور بھٹو کے دور حکمرانی کے آغاز پر پیچھے اور مخلص دوست کی حیثیت سے انہیں حدود نہ پھلانگنے کا مشورہ دینا، جمہوریت کے روپ میں فسطائیت کو پروان چڑھتا دیکھ کر الگ ہو جانا، بعد ازاں مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات سے قبل عوامی تحریک کی نشوونما میں حصہ لینا، جنرل ضیاء الحق کے اقتدار سنبھالنے کے بعد ۱۹۷۸ء سے ان کی کابینہ کا رکن بن جانا، لیکن فروری ۱۹۸۵ء کے الیکشن میں صرف "زخمی" ہو جانے اور پکار پر "ہیرو" بنا کر اعتنا میں اکثر جان چلی جاتی ہے۔ الیکشن کے بعد کی فراغت پر فخر یہ کہنا کہ "ہم تو ناکام پر رہتے ہیں مجھے کام بہت ہے" کہاں سے میر صاحب کی زندگی کے واقعات کا تذکرہ شروع کیا جائے اور کہاں اختتام ہو، یہ سب سے مشکل پہلو ہے اور ان کی زندگی کے بارے میں لکھنے والے کو ہمیشہ دلچسپی رہے گا۔

مجھے حیرت ہوتی ہے کہ سرکاری ذرائع ابلاغ اور نا واقف صحافی انہیں "مسلم لیگی رہنما" لکھ رہے ہیں۔ حالانکہ قیام پاکستان کے وقت وہ تقسیم ہند کے مخالف تھے اور اپنے اس کردار کو کبھی نہیں چھپاتے تھے۔

انہیں اس پر فخر تھا کہ جب لوگ تقسیم ہند کی بات کر رہے تھے تو انہوں نے مخالفت کی اور جبکہ وہی لوگ تقسیم پاکستان کی بات کر رہے ہیں تو مرتے دم تک میر صاحب سے باوجود دوستی کے حمایت حاصل نہ کر سکے۔ میری مراد جی ایم سید سے ہے جن سے میر علی احمد کی دوستی ۱۹۴۳ء سے تھی۔ لیکن ۱۰ مارچ ۱۹۸۶ء کو جب سن میں نعرہ خان بھی تھے اور ممتاز بھٹو بھی، جی ایم سید اپنے دوست میر علی احمد سے پاکستان توڑنے کے حق میں رائے نہ لے سکے۔ میر صاحب اسٹیج پر اپنے اور جی ایم سید کے تقریباً نصف صدی کے دوست رئیس غلام مصطفیٰ بھرگڑی کے ساتھ بیٹھے تھے اور میں ان کے قدموں میں۔ جب ممتاز بھٹو نے اپنی تقریر میں کلہاڑی کے وار کے ذریعہ پاکستان کو ٹکڑے کرنے کی بات کی تو میر علی احمد نے میرا کاندھا پکڑ کر کہا "ظہیر دیکھو یہ رئیس صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔" میں متوجہ ہوا تو بھرگڑی صاحب نے کہا، "جب اقتدار تھا اور کلہاڑی ہاتھ میں تھی تو کیا کرتے رہے؟ آج سندھ کے حقوق کی بات کرنے نکلے ہیں!"

میر علی احمد نے اس تقریب کے بارے میں مجھ سے براہ راست کہا تھا "جناب پاکستان بنانے میں ہم شریک نہیں تھے۔ میں نے سید سے کہہ دیا ہے، یہ بہت تمہاری ہے اور سید دل کی ہر بات بھی دل سے عزیز ہے لہٰذا یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ ہم پاکستان توڑنے میں شریک ہوں۔ پاکستان نہیں بنا تھا تو اور بات تھی لیکن جب بن گیا تو ہم نے کبھی مخالفت نہ کی۔" ان کے ساتھ بیٹھ کر اسی طرح کئی دوسری باتیں اکثر محرم راز دوستوں کے ہمراہ ہونے والی محفلوں میں بلا جھجک دل کی بات کہہ دیتے تھے۔

میر علی احمد نے ۱۹۴۱ء میں جی ایم سید کو خط لکھا کہ "آج اگر آپ پاکستان کے قیام کے لئے پروپیگنڈہ کر رہے ہیں تو نیک نیتی سے ملت کی بہتری کے لئے نہ کر ذاتی نفع یا ذاتی جاہ و جلال کے لئے۔" اسی خط میں مزید لکھا "آپ کو خاکسار تحریک جیسی نظم کش جماعت میں لاکر اگر جلسے جلوس مارچ کرائے اور بیلچہ کندھے پر اٹھوایا تو یہ بھی اسی اخلاص اور جذبے کے تحت۔ لیکن محترم شاہ صاحب ایک عرض کروں گا کہ پاکستان تو کیا، چھوٹی چیز حاصل کرنے کے لئے بھی بہادر سپاہیوں اور مخلص رفیقوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ دنیا میں آج تک جو بھی منصوبے کامیاب ہوئے ہیں، ان میں بہادر سپاہیوں اور مخلص رفیقوں کا بھی حصہ رہا ہے۔"

اس خط پر دو جی ایم سید کو مسلم لیگ سے دوبارہ



میر علی احمد تالپور کی نماز جنازہ کے شرکاء، صدر ضیاء الحق، گورنر سندھ اشرف تابانی، الحاج شمیم الدین، میر رفیق تالپور اور جی ایم سید



میر علی احمد تالپور ۱۹۸۶ء میں جی ایم سید کی سالگرہ کے موقع پر





۲۰ فروری ۷۷ء کو حیدرآباد کے مارکیٹ چوک پر بھٹو کی گالی کا جواب دیتے ہوئے میر صاحب کا انداز خطابت

خاکسار تحریک کی طرف راغب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جبکہ ایک دوسرے خط میں زندگی کے سفر کے بارے میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

"بے ناخداؤں کے سپرد نہ کر دیجیے مجھے
اے صبر میں نے آن کی لی ہے تیری پناہ

میں سمجھتا ہوں کہ کولمبس جب اپنا جہاز لے کر نکلا ہوگا تب اسے راہ میں کئی چھوٹے چھوٹے جزیرے ملے ہوں گے۔ سفر کی طوالت اور مسافت کی تھکاوٹ اس بات کی متقاضی ہوگی کہ اب جو بھی جزیرہ ملے اسے منزل مقصود تصور کر کے وہاں لنگر انداز ہو جائے۔ لیکن یہ شاید کولمبس کی ہمت تھی یا اس کے تصور کی بلندی جس نے اسے چھوٹے جزیروں پر قناعت نہ کرنے دی۔"

ایک جگہ مسلم لیگ سے دامن بچانے کے بارے میں پاکستان بننے کے بعد مئی ۱۹۴۹ء میں جی ایم سید کو لکھتے ہیں، "جاگیرداروں اور زمینداروں کی میٹنگ میں جانے کی زبردست تیاریاں تھیں۔ مہربان بالمشافہ دعوت بھی دے گئے تھے لیکن میں موقع پر جانے کی ہمت پیدا نہ کر سکا۔ دل میں کہا کہ بقول حضرت مومن

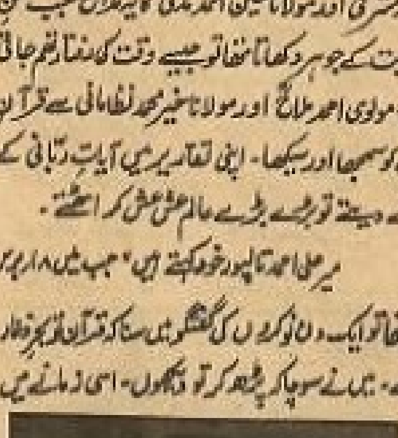
عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

آج تک کا عمل ان بزرگوں سے اختلاف میں گزرا، اب یکایک پلٹا کھانا زیبا نہیں۔ دل میں کہا کہ دنیا کے ساتھ رہنا چاہیے۔ جس رسول کا پیام ایمان ہے وہ غریبوں کے ساتھ رہنے، غریبوں کے کیمپ میں رہنے کی تلقین کرتا ہے۔"

عشق بتاں کی بات آئی ہے تو ان ہی خطوط میں سے ایک خط میں، جو فروری ۱۹۴۲ء میں علی احمد تالپور نے جی ایم سید کو مدراس سے چار سو میل دور ریلوے اسٹیشن اوٹاکمنڈ سے لکھا اور جس میں سید صاحب کو بتایا کہ "ریش جیرگزسی کے جانے کے بعد میں ایک انگریز لیڈی کے گھر مقیم ہوں۔ لیکن جناب کو غلط فہمی نہ ہو وہ خاتون ۷۰ برس کی ہیں۔ جی ہاں ۷۰ برس کی۔ کہیں یہ نہ سمجھا کریں ۷ کے پیچھے ایک لگانے کے بجائے آگے صفر لگا رہا ہوں۔"

میر علی احمد خطوط نویسی اور کتب بینی، فی البدیہہ اشعار پڑھنے اور چبھتے ہوئے جملوں سے محفل کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں یکتا تھے۔ انہیں خطابت میں بھی کمال حاصل تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد، عطاء اللہ شاہ بخاری، علامہ مشرقی اور مولانا حسین احمد مدنی کا یہ مداح جب فن خطابت کے جوہر دکھاتا تھا تو جیسے وقت کی رفتار تھم جاتی تھی۔ مولوی احمد ملاح اور مولانا خیر محمد نظامانی سے قرآن پاک کو سمجھا اور سیکھا۔ اپنی تقاریر میں آیات ربانی کے حوالے دیتے تو بڑے بڑے عالم عش عش کر اٹھتے۔

میر علی احمد تالپور خود کہتے ہیں "جب میں ۱۸ برس کا تھا تو ایک دن نوکروں کی گفتگو میں سنا کہ قرآن تو [illegible] ہے۔ میں نے سوچا پڑھ کر تو دیکھوں۔ اسی زمانے میں



میر علی احمد تالپور کے صاحبزادے اور سندھ اسمبلی کے رکن میر حیدر علی تالپور

مولانا تاج محمد امروٹی نے قرآن پاک کا سندھی میں ترجمہ کیا تھا۔ میں نے یہ ترجمہ منگوایا اور ایک ماہ میں پورا پڑھ ڈالا۔ اس کے بعد مت پوچھئے کہ قرآن پاک نے میری زندگی میں کتنے اثرات مرتب کئے۔ بس یہ سمجھئے کہ جس کتاب کو میں نے سب سے زیادہ مطالعہ میں رکھا ہے، وہ قرآن پاک ہے۔"

میر صاحب ۱۶ برس کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اس مرحلے پر ان کے نانا کے ملازم دیارام بھرو نے ان کی خاص رہنمائی کی، حوصلہ دیا ورنہ تالپور برادری کے سامنے خود بقول میر صاحب کے، ان کی زندگی ہمک داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ میر صاحب کہتے ہیں "ہمارے خاندان نے کورٹ آف وارڈز میں جانے کا فیصلہ کیا تو دیارام بھرو باہر کھڑا تھا۔ میں نے باہر نکل کر اسے خاندان کا فیصلہ سنایا تو وہ ہنس پڑا اور کہا 'میاں صاحب، لوگ کیا کہیں گے کہ میر صاحب مرحوم (میر اللہ بخش خان) نے اپنے خاندان میں کوئی مرد نہیں چھوڑا؟' میں نے لاچاری سے کہا، 'دادا بھلا میں کیا کر سکتا ہوں؟' تو اس نے ایکدم کہا 'میاں تو سب کچھ کر سکتا ہے۔' اس کے یہ الفاظ اتنے پراثر تھے کہ ہم نے کورٹ آف وارڈز میں جانے کا فیصلہ ترک کر دیا اور صرف دو سال میں ۱۶ سال کے نوجوان نے پوری تالپور برادری پر فتح پالی۔" حاجی اسد بھرو کا نوے سال کی عمر میں ۱۹۵۱ء میں انتقال ہوا۔ میر صاحب نے کہا تھا "اگر کبھی میں نے کتاب لکھی تو اس عظیم شخص کے نام اسے منسوب کروں گا کیونکہ یہ مجھے والدین سے زیادہ عزیز تھا۔"

میر علی احمد ان سیاسی شخصیات کے بارے میں اپنے تاثرات و مشاہدات پر مبنی ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے جن کے وہ شریک سفر رہے لیکن سفر زندگی



۱۹۷۰ء کی احتجاجی مہم میں میر علی احمد تالپور ایک جلوس کی قیادت کرتے ہوئے۔

اچانک ہی ختم ہوگیا۔ نہ یہ تاریخی کتاب انہوں نے لکھی اور نہ اس کا انتساب حاجی سرعبود کے نام لکھا جاسکا۔

کتاب کی بات آئی ہے تو میں یہ بتاتا چلوں کہ میر علی احمد ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو صرف لائبریریاں سجا لیتے ہیں، اپنی علم دوستی کی نمائش کرتے ہیں۔ حقیقتاً ان کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، حبیب جالب، احسان دانش کون شاعر اور ادیب ہے جس سے میر علی احمد کی دوستی یا شناسائی نہ تھی۔ جوش صاحب نے میر صاحب کو ایک کتاب دیتے ہوئے "یاقوتی سخن" کا خطاب تحریری طور پر عطا کیا۔ میر علی احمد نے کہا یہ خطاب مجھے ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے زیادہ عزیز ہے اس سے زیادہ مقدم ہے۔ پھر بھلا میر صاحب جیسے صاحب مزاج کے آدمی کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری کیوں چاہئے؟ انہوں نے تو اس وقت سیاست میں قدم رکھا تھا جب سیاست کا صلہ انعامی زمینیں اور خاندانوں کیلئے مفت کی جاگیریں تھیں۔

میر علی احمد کا مسلم لیگ سے مختصر سے عرصے کے لئے اس وقت تعلق قائم ہوا جب بقول ان کے خان بہادر کھوڑو کی دوستی ۱۹۵۱ء میں انہیں مسلم لیگ میں لے گئی ورنہ وہ مزاجاً خاکسار، ارادتاً احرار اور طبعاً حریت پسند تھے، مسلم لیگ کے جاگیردارانہ مزاج سے کوسوں دور۔ میر علی احمد تالپور ۱۹۳۰ء سے مختلف تحریکوں، تنظیموں اور جماعتوں میں اجتماعی قیادت کے مزاج کی تلاش میں سرگرداں رہے لیکن ۵۷ برس کی تگ و دو کے باوجود انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ بقول شاعر ؎

نہ پوچھو عہد الفت کی بس اک خواب پریشاں تھا
نہ دل کو راہ پر لائے، نہ دل کا مدعا سمجھے

۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۶ء تک تحریک احیائے ملت، ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء تک کانگریس اور پھر ۲۶ جون ۱۹۴۷ء تک خاکسار تحریک۔ قائد اعظم، گاندھی، ابوالکلام آزاد، سبھاش چندر بوس، سید سلیمان ندوی، خان غفار خان، علامہ مشرقی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، حسین شہید سہروردی، محترمہ فاطمہ جناح، شیخ عبدالمجید سندھی، شاہنواز بھٹو، ذوالفقار علی بھٹو، ایوب کھوڑو، غرض ایک طویل فہرست ہے برصغیر پاک و ہند کی نامور شخصیات کی جن سے میر علی احمد تالپور کی یاد اللہ اور صاحب سلامت رہی۔ کسی کو انہوں نے بہت نزدیک سے پرکھا اور کسی کو قدرے فاصلے کے ساتھ۔

میر علی احمد کی زندگی بہت سے حادثات سے عبارت ہے۔ ان میں ایک حادثہ بھٹو سے قربت اور پھر دوری کا ہے اور دوسرا حادثہ صدر ضیاء الحق کی کابینہ میں تقریباً ساڑھے چھ سال وزیر رہنے اور بعد ازاں فروری ۸۵ء کے انتخابات میں شکست کھانے کا ہے۔ میر علی احمد نے غیر ملکی ذرائع ابلاغ کی نگاہ میں مستقبل کے وزیر اعظم کی جگہ پائی تھی، لیکن انہیں جس طرح شکست ہوئی، اس پر ان کے احباب نے بہت سے شکوے کئے لیکن میر صاحب کا ظرف یہ تھا کہ کبھی کوئی گلہ کی بات زبان پر نہ لائے۔ شکست کے بعد انہیں ستانے والے، زخموں پر نمک چھڑکنے والے اور تلخ باتوں کو دہرانے والے متواتر ان سے ملتے رہے لیکن میر صاحب مسکراتے مگر خاموش لبوں سے یہی کہتے رہے ؎

تعزیر سیاست ہے نہ غیروں کی خطا ہے

میر علی احمد تالپور ان لوگوں میں سے ہیں جو اختلاف رائے کا اظہار کرتے ہوئے کسی مقام اور رتبے کا لحاظ کرتے تھے۔ جس شخص نے بھٹو کو اقتدار میں آنے سے قبل مجیب سے محاذ آرائی نہ کرنے، اپوزیشن بنچوں پر بیٹھنے اور جمہوری عمل سے عوام کی تائید کے ساتھ اقتدار میں آنے کا مشورہ دیا تھا وہ شخص اسمبلی کے فلور پر کس طرح خاموش رہتا۔ نہ مارشل لا جاری رکھنے کی حمایت کی نہ ۱۹۷۳ء کے آئین کی اور نہ بلوچستان اور سرحد کی حکومتوں سے تصادم کی، نتیجہ یہ ہوا کہ راہیں جدا ہوگئیں۔ آخرکار چھوٹے بھائی میر رسول بخش تالپور نے ۱۲ فروری ۱۹۷۳ء کو گورنر کے عہدے سے استعفیٰ دے کر "کوچہ" چھوڑنے کا اعلان کرکے مفاہمت کے تمام راستے بند کردیئے۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو جب میر علی احمد نے ایک پریس کانفرنس میں پیپلز پارٹی کی بنیادی رکنیت سے استعفیٰ دینے کا اعلان کیا تو کہا تھا،

"۱۹۶۵ء کے بی ڈی انتخابات کے نتائج اور حکمران ٹولے کے تشدد کے نتیجے میں اس وقت کی حزب اختلاف کی سیاسی جماعتیں باہمی انتشار کا شکار تھیں اور ایوبی آمریت پر کسی بھرپور ضرب لگانے کے لائق نہیں تھیں جبکہ عوام تبدیلی اور جدوجہد کے لیے آمادہ تھے۔ مسٹر بھٹو کو جناب ایوب خان نے علیحدہ کردیا تھا اور وہ سیاسی پناہ کی تلاش میں تھے۔ ہم نے نہ صرف انہیں سیاسی پناہ دی بلکہ اپنی سیاسی ساکھ اور ووٹوں کی طاقت کے ذریعے سندھ کے گوشے گوشے میں روشناس کرایا۔ میر رسول بخش نے یہ بھی کہا تھا۔



حیدرآباد میں میر علی احمد کی کتاب [illegible] کی تقریب رونمائی سے خطاب کرتے ہوئے۔



"کہا جاتا ہے مسٹر بھٹو نے میری شخصیت بنائی، مجھ پر احسان کیا، احسان کس کو کہا جاتا ہے اور احسان فراموشی کیا ہوتی ہے؟ اس کا فیصلہ میں نے سندھ کے عوام پر چھوڑ دیا ہے کیونکہ عوام ہی بہتر منصف ہیں۔ میں احسان جتانا نہیں چاہتا لیکن اس ضمن میں اتنا عرض ضرور کروں گا کہ ۱۳ دسمبر ۱۹۶۶ء کو جب کہ پہلے سندھ میں موجودہ وزیر اعظم کو جلسے کی جگہ نہ مل رہی تھی یہاں تک کہ حیدر آباد کے اس ہوٹل میں بھی جس کا انہوں نے وزیر خارجہ کی حیثیت سے افتتاح کیا تھا تو میں نے اپنے غریب خانے میں سیاسی پناہ دی، میں نے المرتضیٰ یا ۷۰ کلفٹن کا طواف نہیں کیا تھا۔ اس وقت بھٹو صاحب کے پاس سیاسی مفلسی کے سوا کیا تھا؟"

۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۷ء تک پیپلز پارٹی کا عرصۂ اقتدار میر برادران نے ابتلا و آزمائش میں گزارا جب مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے لیے حزب اختلاف صف آرا ہوئی تو میر برادران کی قوت باوجود پی این اے میں نہ ہونے کے پی این اے کے پلڑے میں تھی۔ حیدر آباد، پیپلز پارٹی کے لیے ناقابلِ تسخیر بن گیا تھا اور اسے ناقابلِ تسخیر بنانے میں میر برادران کا اہم حصہ تھا، میروں پر قاتلانہ حملہ کرایا گیا، میر فیض محمد تالپور شہید ہوئے، پھر جناب بھٹو کو ورغلایا گیا کہ میر آپ کو گالیاں دیتے ہیں، انہوں نے ہمارے دفاتر جلا ڈالے ہیں، جھنڈے اتار پھینکے ہیں تو مسٹر بھٹو نے جوشِ غضب میں پولیس گراؤنڈ پر جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے میر برادران کو کھلم کھلا ماں کی گالی دی۔

یہ گالی نہیں تھی گولی تھی، بلوچ غیرت نے بہت جوش مارا، ایک دن بعد ہی جوابی طور پر ۲۰ فروری ۷۷ء کو مارکیٹ چوک پر عظیم الشان جلسۂ عام ہوا، میر علی احمد نے تقریر کرتے ہوئے بھٹو کی شخصیت کی دھجیاں اڑا دیں مگر دائرۂ تہذیب میں رہ کر، مجمع میں سے کسی نے کھڑے ہو کر کہا گالی کا جواب گالی سے دیں لیکن میر علی احمد نے اسے ڈانٹ کر بٹھا دیا اور کہا، ہماری لغت میں گالی نہیں ہے۔

ان زیادتیوں کے باوجود جب اقتدار سے محروم بھٹو کی جانب سے میر برادران سے تجدید دوستی کے لیے رجوع کیا گیا تو انہوں نے دروازے بند نہ کیے۔ میر علی احمد نے بتایا تھا "میرے پاس پہلے مشتاق بھٹو آئے تھے، انہوں نے کہا جو زیادتیاں ہوئی ہیں، انہیں بھول جائیے اور معاف کر دیجیے، بھٹو صاحب کی مرضی ہے کہ آپ پیپلز پارٹی میں آ جائیں۔ پھر بیگم نصرت بھٹو نے اپنی بہن اور ان کی دو بیٹیوں کو میرے پاس بھیجا۔"

لیکن تجدید دوستی کے یہ مذاکرات اس لیے ناکام ہو گئے کہ مسٹر بھٹو کے ذہن سے ابھی انتقام کا خیال نہ نکلا تھا۔ جب ایک اخبار میں مسٹر بھٹو کی یہ

اخلاص و دیانت، وضع داری اور ہر مظلوم کی حمایت ان کی شخصیت کے نمایاں اوصاف تھے۔

بات چھپی کہ پھر برسر اقتدار آئے تو میر برادران کو فکس اپ کر دیں گے۔ تو میر علی احمد نے کہا اب کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ دوستوں کی قدر کرنے اور دوستیاں نبھانے والے میر برادران تجدید دوستی کے مذاکرات منقطع کر کے لاتعلق ہو گئے۔ میر علی احمد کا کہنا تھا کہ "قرآن پاک کی اپروچ اجتماعی قیادت کی رہی ہے۔ قرآن پاک نے جب کبھی رسول اللہ کو مخاطب کیا تو ساتھ ان کے رفقاء کا ذکر کیا، اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کا ذکر آیا تو عیسیٰ ابن مریم اور ان کے حواری کہہ کر پکارا گیا۔ قرآن پاک میں شخصی حکمرانی کا فلسفہ نہیں ہے۔"

میر علی احمد شخصیت پرست نہ تھے، انہیں متاثر کرنے والے مولوی، حافظِ قرآن، مترجم قرآن بڑی حیثیتوں کے مالک تو تھے لیکن دنیاوی اعتبار سے صاحبِ اقتدار نہ تھے۔ میر علی احمد نے کہا "میرا ایمان ہے کہ یہ ملک اجتماعی قیادت کے بغیر نہیں چل سکتا۔" میرا ذاتی تجزیہ ہے کہ وہ جی ایم سید کی اصطلاح میں آئیڈیلسٹ تھے، اگر پریکٹیکل پالیٹیشن ہوتے تو فروری ۱۹۸۵ء کا الیکشن معمولی ووٹوں سے کبھی نہ ہارتے کیونکہ پریکٹیکل پالیٹیشنز کے نزدیک صرف جیت کا تصور ہوتا ہے اور وہ ہر صورت میں اقتدار تک پہنچنے کی راہ ہموار کر لیتے ہیں۔ جب میر علی احمد کو شکست ہوئی تو دل چاہا کہ ایک مضمون لکھوں جس کا عنوان ہو — تجھے اے جگر مبارک یہ شکستِ فاتحانہ

میر علی احمد تالپور نے صدر ضیاء الحق کی کابینہ میں شمولیت کیا اختیار کی کہ بعض لوگوں کے نزدیک جو دہلیزِ اقتدار کو بوسہ دینے کے لیے خود ہمیشہ بے تاب رہے ان کا یہ قصور ناقابلِ معافی ہو گیا۔

فروری ۱۹۸۵ء کے الیکشن میں مخالفین نے انہیں "تارا مسیح" کہہ کر جذبات بھڑکائے اور پھر بے بی بے نظیر کو تقریریں لکھ کر دینے والوں نے حیدر آباد کے جلسۂ عام میں مئی ۸۶ء کے دوران انہیں "تارا مسیح" کہلوا دیا، لیکن ان باتوں سے بھلا میر علی احمد کی عزت کیا کم ہونی تھی؟ انتقام جن لوگوں کی سیاست کا محور رہا ہو، محبت کی بات کرنے والوں پر وہ عارضی طور پر غلبہ تو پا سکتے ہیں، ہمیشہ کے لیے نہیں۔ ایسے لوگوں کو صرف موت شکست دے سکتی ہے۔

۸ اپریل کو جب میر علی احمد تالپور کا جنازہ ٹنڈو میر محمود سے نکلا تو ایسا لگا جیسے میر صاحب کی شگفتہ آواز آ رہی ہے۔

— میرے جنازہ گر کو نوید ہو صفِ دشمناں کو خبر کرو
جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا

میر علی احمد کی شگفتگی اور زندہ دلی اسی دن سے سمٹ گئی تھی جب مئی ۱۹۸۲ء میں میر رسول بخش کا انتقال ہوا، وہ اپنے چھوٹے بھائی سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور چھوٹے بھائی کی بات کو اپنے لیے حکم کا درجہ دیتے تھے۔ چھوٹے بھائی کا انکار بھی قابلِ دید ہوتا تھا۔ باقاعدہ قدموں کو چھو کر بھائی کی محفل میں بیٹھتے۔

جب بھٹو دور میں نیپ کی قیادت کے ساتھ بلوچستان کے تمام بڑے لیڈر حیدرآباد جیل میں مقید تھے تو میر برادران نے ان کی مہمان نوازی میں کوئی کسر نہ

چھوڑ دی۔ ایوب خان کے دنوں میں جب کچھ بلوچ لیڈروں کو پھانسی دی گئی تھی تو میر رسول بخش ان کی نعشیں لے کر بلوچستان گئے تھے۔ اسی طرح انہوں نے بھٹو کے دنوں میں نظر بند بلوچ اور پشتون قیادت کے اہل خانہ کے لیے اپنے گھر کے دروازے کھول دیے تھے۔

میر علی احمد تالپور نے ۱۹۸۴ء میں ایک سندھی رسالے کو انٹرویو دیتے ہوئے اس سوال کے جواب میں کہ اگر آپ کی بھٹو سے صلح ہو تو آپ کن باتوں پر کریں گے؟ کہا تھا: اول تو صوبائی خود مختاری اور اس کے بعد قانون کی حکمرانی ہونی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ ایک آدمی کے لیے سب جائز ہیں۔ لیکن سب سے پہلے یہ مسئلہ ہے کہ ملک کے صوبوں کی ریاستی حیثیت تسلیم کی جائے، اس کے بعد عام انتخابات۔

انہوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ جب میں نے ۲۵ جنوری ۷۲ کو مسٹر بھٹو کو خط لکھا کہ ہمارا مینڈیٹ ختم ہو گیا ہے، عام انتخاب کرائے جائیں، تو ناراضگی کا آغاز ہوا۔

اسی انٹرویو میں میر علی احمد کے بھتیجے بیٹے میر محمد علی تالپور کا ذکر آیا تھا جو اس وقت کی اخباری اطلاعات کے مطابق پہاڑوں پر گوریلا جنگ میں بلوچوں کی حمایت میں لڑ رہا تھا۔


A. A. TALPUR
FLAT 8B
21 SEYMOUR STREET
LONDON
W1H 5AB

لندن 22.1.87

عرفان ملک کے نام مرحوم کا خط

— آخری دنوں کی ایک تحریر

سب سعی میں مشغول ہیں حاصل کی نہ پوچھو
مغرب کے خضر ساتھ ہیں منزل کی نہ پوچھو
ہے بحث و مباحثے میں رواں کشتی امید
لہروں کی لپک دیکھو تو ساحل کی نہ پوچھو

لندن ۲۲/۱/۸۷

بہت ہی پیارے عزیزم ملک عرفان صاحب
السلام علیکم و۔ اما بعد!

آپ کا عنایت کردہ خوب صورت کارڈ ملا پڑھا، دل مسرور ہوا۔ اللہ پاک آپ کو معہ بیگم ثریا کے اور بچوں کے شاد و آباد رکھے خیریت و سلامتی اور اقبال جیسے آپ کا تعاقب کرتے رہیں آمین —

میرے ایڈریس کا علم دوستوں سے زیادہ مخالفوں کو تھا۔ خود مجھے بھی اس بات پر تعجب ہوا۔ ؎

وہ دشمنی سے دیکھتے ہیں، دیکھتے تو ہیں
میں شاد ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں

ویسے سب سے اوپر کا شعر پوری قوم کی زندگی کی عکاسی کر رہا ہے۔ امید ہے آپ کو پسند آیا ہو گا۔ پوری قوم کا کیا ہو بے حسیاں ہیں!!!

آپ مع احباب بے حد یاد آتے ہیں۔ آپ یقین جانئے اس تمام مجلس کی ملک عرفان جان ہوتا ہے اور ظاہر ہے جان بڑی ہی عزیز ہوتی ہے۔ آج کل کیا سرگرمیاں ہیں اور ثریا کی شاعری کا کیا حال ہے؟ یہاں برف باری ایک ہفتے سے اپنے اوج کمال پر ہے جس طرح ہمارے ان آفات سماوی میں مرنے معطل ہو جاتی ہے، یہاں کا بھی یہی حال رہا۔ کوئی جدید ٹیکنالوجی ان کے کام نہ آئی، حالانکہ خود ان کی میڈیا کہہ رہی تھی کہ روس اور سویڈن میں ایسا کیوں نہیں ہوتا جہاں نقطہ انجماد ۵۰ اور ۶۰ ڈگری تک پہنچ جاتا ہے۔ میں ایک جگہ پر بیٹھنے والا، اس کو بھی چار دن اپنے فلیٹ میں گزارنے پڑے، اس کی وجہ جوتوں کی نزاکت بھی تھی جو روانی برف باری میں بھی پھسلتے ہیں۔ اخبار جنگ اور دی گارجین روز آتے ہیں۔ ان سے اپنے ملکوں کا پتہ پڑتا رہتا ہے۔ یہ باتیں اچانک کی نہیں ہیں۔ پوری قوم نے پوری "محنت" سے ان حالات کو پیدا کیا ہے۔ ان کا ثمر بھی تو حاصل ہمارے حکمران کرے گا۔

؎ وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

اللہ پاک اہل پاکستان کی رہنمائی فرمائے اور ہمیں توبہ کی توفیق عطا فرمائے تا کہ ہم ان آفات سے جان چھڑا سکیں۔ وقت ہو اور اگر وقت نکال سکیں تو "ترجمان القرآن" مولانا ابو الکلام آزادؒ اور ان کا تذکرہ ایک دفعہ مع غبار خاطر کے ضرور پڑھ ڈالیے اگر پہلے پڑھا ہے تو ایک دفعہ اور زحمت کر کے پڑھ لیں۔

عزیزہ ثریا کو اور بچوں کو محبت سے پیار اور دعائیں تمام احباب کو نیاز و سلام۔ لعل صاحب (لعل بن یوسف) کو کارڈ لکھا تھا، خدا جانے ان تک پہنچا یا غائب ہو گیا، معلوم ضرور کریں اور میری طرف سے ان کو سلام پہنچا دیں۔

الحمد للہ، اللہ پاک کے کروڑ ہا احسانوں سے میں بالکل خیریت سے ہوں اور تندرستی کی طلب ہے۔ والسلام

دعا گو
علی احمد خان

جی ایم سید نصف صدی کی دوستی کے باوجود علی احمد تالپور سے پاکستان توڑنے کے حق میں رائے نہ لے سکے۔

میر محمد علی ایوب خان کے آخری دنوں میں گھر سے چلا گیا تھا، وہ غریب عوام خصوصاً بلوچوں کی نجات کا راستہ گوریلا جنگ قرار دیتا تھا۔ اسی بیٹے کے تعلق سے بھٹو نے میر برادران پر "وطن دشمنی" کا الزام لگایا تھا، حالانکہ بھٹو صاحب بھی جانتے تھے کہ میر محمد علی تالپور کے چلے جانے کے بعد ماں باپ نے بھی اس کی صورت نہیں دیکھی۔ ماں اسی غم میں چل بسی اور باپ بھی۔ یہی کہتے ہوئے رخصت ہو گیا کہ جہاں رہے اللہ کی امان میں رہے۔ بعض لوگوں کے مطابق محمد علی حیات ہے لیکن اس کا ٹھکانہ معلوم نہیں۔

میر علی احمد کے بڑے فرزند میر نبی بخش ہیں اور چھوٹے میر حیدر علی جو فروری ۸۵ء کے انتخابات میں صوبائی اسمبلی کے حلقے سے رکن اسمبلی منتخب ہوئے۔ میر صاحب کی دو بیٹیاں ہیں اور دونوں شادی شدہ۔ ایک میر غلام عباس سے بیاہی ہے اور ایک میر رسول بخش کے اکلوتے فرزند میر رفیق احمد تالپور کی رفیقۂ حیات ہے۔

میر علی احمد نے میر حیدر علی کی والدہ کے انتقال کے بعد یوپی کے ایک گھرانے میں دوسری شادی کی تھی۔ میر صاحب کے دوست مشہور کمپیئر طارق عزیز نے جب شادی کی تو میر صاحب نے انہیں مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ شادی عمر کے حساب سے نہیں دل کے حساب سے کی جاتی ہے۔

کچھ لوگوں کے مطابق میر رسول بخش کے مقابلے میں میر علی احمد نے کتابوں، خوشبوؤں اور احباب کی دوستیوں میں وقت گنوا دیا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میر صاحب کی دور اندیشی اور معاملہ فہمی کی بنیاد ہی یہ مجالس تھیں۔ صاحبانِ علم و ادب سے انہوں نے زمانے کے پیچھے چلنا نہیں زمانے کے آگے چلنا سیکھا۔

انہوں نے جنوری ۱۹۷۴ء میں قومی اسمبلی میں ایک تحریک التوا پر بحث کرتے ہوئے کہا تھا: "اگر پنجاب بیدار نہ ہوا تو وہ وقت بھی آئے گا جب پنجاب کو سندھودیش کے لیے اپنا سفیر بھیجنا پڑے گا۔"

اتنی کھری اور قبل از وقت تنبیہ بھلا کسی اور سیاست دان نے کی ہوگی۔ ضیاء الحق کے مارشل لا میں میر صاحب کے بعض دوستوں نے انتہا پسندانہ سوچ کا اظہار کیا تو میر صاحب نے دوٹوک کہہ دیا کہ ہمارا اور آپ کا راستہ جدا ہے۔ وہ کہتے تھے پاکستان اس خطے کے مسلمانوں کی صدیوں کی جدوجہد کا حاصل ہے، ہم اس کی جان سے زیادہ حفاظت کریں گے۔ اس ملک کو ہم اپنی نااہلیوں کی سزا کیوں دیں۔ انہوں نے اپنے انٹرویو میں واضح طور پر کہا تھا: "میری وفاداری پاکستان، اسلام اور پاکستان کے عوام سے ہے۔"

میر علی احمد تالپور اب سپردِ خاک ہو چکے، خاموش ہو گیا چمن بولتے بولتے، لیکن ان کی وہ باتیں جن سے سیاست کے آداب کا پتہ چلتا تھا، پاکستان سے محبت عیاں ہوتی تھی، عوام سے ہمدردی جھلکتی تھی، دوستوں کے لیے خلوص نمایاں ہوتا تھا، محفلِ شعر و ادب کی آن بڑھتی تھی، تاریخِ وطن کے گمشدہ اوراق یکجا ہوتے تھے، ہمیشہ یاد رہیں گی۔ ۱۹۸۳ء کی بات ہے جب میری کتاب "اب بھی زندہ ہیں" منظرِ عام پر آئی تو میں نے اس کی تقریبِ رونمائی کے لیے بیک وقت پروفیسر کرار حسین اور میر علی احمد تالپور سے رجوع کیا۔ کسی نے کہا پروفیسر کرار حسین وزراء کی محفل میں نہیں آتے لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ میر صاحب کو حکومت کا وزیر نہیں، اپنا وزیر سمجھتے ہیں۔ نصف صدی کی دوستی انہیں انکار نہ کرنے دے گی۔ اور یہی ہوا کہ دونوں صاحبان نے مجھے عزت بخشی۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ کرار حسین صاحب نے جو دن اور وقت مقرر کیا وہی دن اور وقت میر صاحب نے قبول کر لیا اور جب تقریبِ رونمائی میں تقریر کے لیے اٹھے تو کرار صاحب سے اس گستاخی کی معافی مانگی کہ انہیں ان کے بعد اظہارِ خیال کرنا پڑ رہا ہے۔

میر صاحب کی یہ تقریر ان ہی کی آواز میں میرے پاس محفوظ ہے اور ہمیشہ ان کی محبت کی یاد دلائے گی۔ انہوں نے جن الفاظ کے ساتھ یاد رکھا وہ میرے لیے بڑا سرمایہ ہیں۔ جب ان کے رفیقِ خاص محمد عمر سومرو لرزیدہ آواز میں جدائی کا غم کر رہے تھے۔ تو میرا دل چاہا کہ فیض کی زبان میں کہوں۔

ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غمِ الفت کے
اتنے احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں
ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے
جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

میر علی احمد تالپور کی نمازِ جنازہ سابق ایم این اے مولانا محمد علی رضوی نے پڑھائی۔ نمازِ جنازہ اور جلوسِ جنازہ میں ان کے ہزاروں عقیدت مندوں، دوستوں اور اقارب کے علاوہ صدر ضیاء الحق، جنرل اختر عبدالرحمٰن، جنرل رحیم الدین، جنرل جہاں داد خان، قاضی عابد، جنرل بشیر خان، اشرف تابانی، الحاج شمیم الدین، نواب راشد شفقت جاموٹ، راجہ ظفر الحق، نسیم احمد اور بہت سے سرکاری زعماء و افسران کے علاوہ سیاست دانوں میں سے جی ایم سید، مولانا وصی مظہر ندوی، نواب یامین، سید احمد یوسف، مخدوم امین فہیم، آفاق شاہد، عبداللہ تالپور، علامہ عزیزی، معراج محمد خان، پروفیسر غلام مصطفیٰ شاہ، ہارون احمد، سعید حسن، نجم الدین سوہو، ملک لعل خان، نواب عبدالواحد آریسر، شبیر ہاشمی، شاکر جعفری، دوست محمد فیضی، قاسم پٹیل، حنیف قریشی، جام کرم علی، اور بہت سے مقامی رہنماؤں نے شرکت کی۔

جی ایم سید نے ایک شخص کا سہارا لے کر نمازِ جنازہ ادا کی۔ صدر ضیاء الحق اور جی ایم سید کی ملاقات بھی نمازِ جنازہ سے قبل چند منٹ کے لیے ہوئی۔

خاکساروں کا ایک دستہ بھی اپنے عظیم خاکسار کو آخری سلامی دینے کے لیے موجود تھا۔ خاکسار لیڈر لطیف بٹ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے یہ سانحہ میروں کے گھر نہیں، ہمارے گھر ہوا ہے۔ ماتم ہمارا ہے۔ جبکہ اکبر بلگرامی طبع شدہ منظوم خراجِ عقیدت تقسیم کرتے ہوئے میر صاحب کی موت کو اپنا نقصانِ عظیم بتا رہے تھے۔

غرض جس سے پوچھتے وہ یہی کہتا ہوا نظر آتا کہ "میں لُٹ گیا، حیدرآباد اُجڑ گیا"۔ سینیٹر شیخ علی محمد، لعل بن یوسف، عرفان ملک، احسان عظیم، ابراہیم جویو، الطاف رند اور میر گلزار تو تھے ہی حلقۂ احباب میں، ان کا غم کیا پوچھنا لیکن میں نے ٹنڈو میر محمود کے عام بچوں اور بوڑھوں کو دل گرفتہ اور رنجیدہ دیکھا۔

یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ میر صاحب تسبیح جو کر تھے نہ غلام طفلِ دہر، جہاں میں ان کی فطرت مزدور تھی لیکن وہ کبھی کسی جشن کا ساغر نہیں بنے۔ اور یہی کچھ تو علامہ اقبال کی رباعی کی صورت مجھ سے میر صاحب نے انٹرویو کے آخر میں کہا تھا۔

لیکن بقول میر تقی میر انہیں یہ شکوہ ضرور رہے گا۔

ان کے الطافِ چند روزہ سے
عمر نے ہم سے بے وفائی کی

●●